سورۃ البقرۃ

آیت ۸۳

ملاحظہ : کتاب میں حوالہ کیلئے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغۃ کیلئے ۱، الاعراب کیلئے ۲، الرسم کیلئے ۳ اور الضبط کیلئے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لئے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لئے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵۰:۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھٰکذا۔

۲ : ۵۱ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِ يْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○

۲ : ۵۱ : ۱ اللغہ

[وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَاءِ یْلَ] یہ ایک مکمل جملہ ہے جو کل چھ کلمات پر مشتمل ہے۔ ان تمام کلمات کی لغوی بحث اس سے پہلے گزر چکی ہے۔ مثلاً

① "وَ" جو یہاں مستانفہ ہے جس کا مفہوم تو "اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ" کا ہوتا ہے مگر اردو میں اس کا ترجمہ بھی صرف "اور" سے کر لیا جاتا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے [۲ : ۷ : ۱ (۱)]

② "اِذْ" ظرف بمعنی "جب کہ/جس وقت" ہے۔ اس کے استعمال اور اس سے پہلے ایک محذوف فعل (اذ کروا= یاد کرو) کے مفہوم کے بارے میں دیکھئے البقرہ : ۳۰ [۲ : ۲۲ : ۱ (۱)]

③ "اَخَذْنَا" جس کا مادہ "ا خ ذ" اور وزن "فَعَلْنَا" ہے' کے فعل مجرد (اَخَذَ یَاْخُذُ = پکڑنا۔ لینا) پر البقرہ : ۴۸ [۲ : ۳۱ : ۱ (۵)] میں بات ہوئی تھی اور خود زیر مطالعہ صیغہ "اَخَذْنَا" کے لئے دیکھئے البقرہ : ۶۳ [۲ : ۴۱ : ۱ (۱)] یہاں اَخَذْنَا کا ترجمہ ہو گا : ہم نے لیا

④ "مِیْثَاقَ" جس کا مادہ "و ث ق" اور وزن "مِفْعَال" ہے' کے فعل مجرد (وَثِقَ۔ یَثِقُ = اعتماد کرنا) کے معنی و استعمال اور خود اس لفظ "میثاق" کی ساخت' اس میں ہونے والی تعلیل اور اس کے معانی (قول و قرار' عہد وغیرہ) کے لئے دیکھئے البقرہ : ۲۷ [۲ : ۱۹ : ۱ (۱۴)]

صیغہ "اَخَذْنَا" قرآن کریم میں ۲۶ جگہ آیا ہے جن میں سے دس جگہ اس کا استعمال "میثاق" کے ساتھ (معنی عہد لینا۔ قرار لینا وغیرہ) آیا ہے۔ باقی استعمالات (مثلاً عذاب میں پکڑنا وغیرہ) حسب موقع بیان ہوں گے۔

○ ۵/۶ "بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ" جس کا ابتدائی (مضاف) کلمہ "بَنِیْ" لفظ "ابن" کی جمع سالم (بنونَ) کی "مجرور" اور خفیف (بوجہ اضافت) صورت ہے۔ اس پوری اور اسرائیل سے مراد حضرت یعقوب ہیں۔ ترکیب (بنی اسرائیل) کی مکمل لغوی بحث البقرہ : ۴۰ [۲ : ۲۵ : ۱ (۱)] میں ہو چکی ہے البتہ وہاں "بنی اسرائیل" منادیٰ آیا تھا (اے بنی اسرائیل) مگر یہاں یہ لفظ "میثاق" کا مضاف الیہ ہو کر آیا ہے۔ اکثر مترجمین نے یہاں اس کا ترجمہ "بنی اسرائیل" ہی سے کیا ہے' اگرچہ اس کا لفظی ترجمہ "اسرائیل کے بیٹے/اسرائیل کی اولاد" ہو سکتا ہے۔

● اس طرح اس عبارت (واذ اخذنا میثاق بنی اسراء یل) کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "اور جب ہم نے لیا عہد اسرائیل کے بیٹوں/کی اولاد/ کا" ----- جس کی سلیس اور بامحاورہ صورت کے لئے "کا" کی بجائے "سے" کے ساتھ ترجمہ کرنا ہو گا--- اور اس طرح میثاق کے مختلف معانی کے ساتھ ترجمہ کرتے ہوئے اس عبارت کے تراجم "ہم نے لیا قول/اقرار/قول قرار/پکا قول/عہد ----- بنی

اسرائیل سے" کی شکل میں کئے گئے ہیں۔ نیز اردو ترکیب میں "بنی اسرائیل سے" شروع میں اور فعل اور مفعول کا ترجمہ بعد میں لانا پڑتا ہے۔ بعض حضرات نے ترجمہ کے ساتھ بعض تفسیری اضافے کر دیئے ہیں مثلاً "بنی اسرائیل" (کے اگلے لوگوں) سے" یا مثلاً "(توریت) میں عہد لیا" وغیرہ--- جو ترجمہ کی حد سے تجاوز ہے۔

[لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ] اس جملے کے تمام کلمات پہلے بھی زیر بحث آ چکے ہیں۔ مثلاً "لَا تَعْبُدُوْنَ" جو "ع ب د" مادہ سے فعل مجرد کا فعل مضارع منفی کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ اس کے فعل مجرد (عَبَدَ یَعْبُدُ = عبادت کرنا) کے باب' معنی اور استعمال کی وضاحت الفاتحہ : ۵ [۱:۴:۱ (۲)] میں کی جا چکی ہے۔ اسی طرح "لا تعبدون" کا لفظی ترجمہ تو ہے "تم عبادت نہیں کرو گے / کرتے ہو" مگر سیاق عبارت کی وجہ سے یہ یہاں مفہوم فعل نہی کا رکھتا ہے۔ اس پر ابھی کچھ بات ہو گی اور مزید وضاحت "الاعراب" میں آئے گی۔

"اِلَّا" جو حرف استثناء (بمعنی "مگر / سوا / بجز") ہے کے معنی و استعمال وغیرہ پہلی دفعہ البقرہ : ۹ [۲ : ۸ : ۱ (۳)] میں بیان ہوئے تھے اور اسم جلالت (اللّٰہ) تو اب کئی دفعہ آ چکا ہے' البتہ اس کی لغوی بحث کے لئے چاہیں تو دیکھئے [۱ : ۱ : ۱ (۲)]

● یوں اس (زیر مطالعہ) عبارت کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے "تم عبادت نہیں کرو گے مگر اللہ کی"--- اس سے پہلے بنی اسرائیل سے "عہد" لینے کا ذکر ہے اور اس عہد کی شرائط آگے بیان ہو رہی ہیں جن میں پہلی شرط "توحید کا پابند رہنا" تھی جو یہاں ان الفاظ (لا تعبدون الا اللّٰہ) کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ قرآن کریم میں "اخذ میثاق" (عہد لینا) کا جہاں جہاں ذکر آیا ہے اس کے بعد اس عہد کی تفصیل (یا بیان شرائط) (۱) یا تو بصورت فعل امر ہوا ہے۔ یعنی "عہد لیا کہ یوں کرو"۔ اس کی ایک مثال تو البقرہ : ۶۳ [۲ : ۴۱ : ۱] میں گزری تھی جہاں "واذ اخذنا میثاقکم...." (جب ہم نے تمہارا عہد لیا) کے بعد "خذوا" (پکڑیو) آیا تھا اور (۲) کبھی "اخذ میثاق" "قسم لی / حلف لیا" کے مفہوم میں لے کر تفصیل کے لئے "لام تاکید برائے قسم" کے ساتھ مضارع کا صیغہ آتا ہے جیسے "واذ اخذ اللہ میثاق الذین اوتوا الکتٰب" (آل عمران : ۱۸۸) کے بعد "لَتُبَيِّنُنَّهٗ" آیا ہے (یعنی تم ضرور ہی اس کو واضح کر دو گے)--- (۳) اور کبھی لام تاکید و قسم کے بغیر یا امر و نہی کے بغیر سادہ صیغہ مضارع آتا ہے مگر اس میں مفہوم زور دار نہی یا تاکید کا ضرور ہوتا ہے یا یوں کہئے کہ "اخذ میثاق" کے ذکر کے بعد ایک "اَنْ" (یہ کہ) محذوف ہوتا ہے (اس لئے اگلا فعل منصوب تو نہیں ہوتا مگر مفہوم وہی رکھتا ہے)---

● یہی وجہ ہے کہ یہاں بلحاظ مفہوم و سیاق عبارت "لا تعبدون" کا ترجمہ "لا تعبدوا" کی طرح کیا گیا ہے۔ اور اس میں بھی بعض نے تو سیدھا فعل نہی کی طرح ترجمہ کر دیا ہے یعنی "اللہ کے سوا 'کسی کو' نہ پوجو / عبادت نہ کرو" (یہاں ترجمہ میں "کسی کو" کیوں لایا گیا ہے اس پر "الاعراب" میں بات ہو گی) --- جب کہ "میثاق" کی شرط اور تاکید والے مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے اردو محاورے کے مطابق بعض حضرات نے "عبادت نہ کرنا / عبادت مت کرنا / بندگی نہ کریو" سے ترجمہ کیا ہے جس میں نہی کے ساتھ تاکید والا مفہوم بھی موجود ہے۔ پھر زیادہ تر مترجمین نے تو اسم جلالت (اللہ) کے ساتھ ہی ترجمہ کیا ہے اگرچہ بعض نے اردو فارسی کا لفظ "خدا" بھی استعمال کر لیا ہے۔

۲ : ۵۱ : ۱(ا) [وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا] ابتدائی "وَ" عاطفہ (معنی "اور") ہے اور باء الجر (بِ) کا یہاں ترجمہ "کے ساتھ" ہو سکتا ہے۔ یہ (بِ) یہاں بطور صلۂ فعل ہے جس پر ابھی بات ہو گی (اِحْسَانًا کے ضمن میں)۔ نیا لفظ یہاں ایک تو "الْوَالِدَيْن" ہے جو لفظ "والد" کا تثنیہ مجرور ہے۔ اور "والد" کا مادہ "و ل د" اور وزن "فاعل" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "وَلَدَ.... يَلِدُ (دراصل يَوْلِدُ) وِلادَةً" (ضرب سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں : "...کو جننا (یعنی کسی بچے کو جنم دینا)"۔ اس فعل کا اصل فاعل تو عورت (یا کوئی مادہ جانور) ہوتا ہے اور اس کے لئے صیغۂ فعل اس سے مؤنث ہی آتا ہے مثلاً کہیں گے "ولدَتِ المرأةُ" (عورت نے جنا) اس لئے اس سے اسم الفاعل "وَالِدٌ" (بصیغہ مذکر بغیر تائے تانیث) ماں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ دراصل "جننے کا عمل" تو عورت (یا مادہ) سے مختص ہے۔ جیسے کہتے ہیں "امرأةٌ حاملٌ" (حمل والی عورت) اور "امرأةٌ حائضٌ" (حیض والی عورت) --- کیونکہ "ولادت" (جننا) کی طرح "حمل" (پیٹ میں بچہ اٹھانا) اور "حیض" (ماہواری خون آنا) عورت ہی سے خاص ہیں' تاہم ان (صفات) کے ساتھ عورت کے لئے تائے تانیث بھی استعمال ہوئی ہے مثلاً "وَالدةٌ"' "حاملةٌ" یا "حائضةٌ" بھی کہتے ہیں ---- اور بعض دفعہ یہ فعل (ولَدَ يلِد) کسی مذکر فاعل (یا اس کی ضمیر فاعل) کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے اور اس سے مراد "باپ ہونا" ہوتا ہے' جیسے قرآن کریم میں کافروں اور مشرکوں کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے "لَيَقُولُونَ ولدَ اللّٰهُ وَانهم لَكٰذِبُون" (الصافات : ۱۵۲) اسی طرح سورۃ الاخلاص میں فعل "لَمْ يَلِدْ" بصیغۂ مذکر آیا ہے (ان پر حسب موقع بات ہو گی۔ ان شاء اللہ) --- اسی لئے "باپ" کے لئے بھی صیغہ اسم الفاعل "وَالِدٌ" استعمال ہوتا ہے اور "والد" اور "والدۃ" دونوں کا تثنیہ (والدَان / والدَين) استعمال ہوتا ہے اور یہ تغلیب مذکر اس طرح ہے جیسے آپ کہیں "الرجلُ وَالمرأةُ"

صالحان" (مرد اور عورت دونوں نیک ہیں)--- قرآن کریم میں یہ صیغہ تثنیہ "والدان" معرفہ نکرہ مفرد مرکب اور مختلف اعراب کے ساتھ بیس مقامات پر آیا ہے۔

● فعل "ولَدیلِد" متعدی فعل ہے اور اس کا مفعول بنفسہٖ آتا ہے جیسے "وَلَدْنَهُمْ" (المجادلہ : ۲) میں ہے یعنی "ان عورتوں نے ان (مردوں) کو جنا"--- تاہم قرآن کریم میں زیادہ تر یہ فعل محذوف (غیر مذکور) مفعول کے ساتھ آیا ہے۔ اور فعل مجرد کے نو مختلف صیغوں کے علاوہ اس مادہ (ولد) سے مشتق اور ماخوذ متعدد کلمات (ولَدٌ' والِدٌ' ولید' مولود' اولاد وغیرہ) ۹۰ سے زیادہ مقامات پر آئے ہیں۔ دوسرا وضاحت طلب لفظ اس عبارت میں "اِحْسَانًا" ہے جس کا مادہ "ح س ن" اور وزن "اِفْعَالٌ" ہے۔ گویا یہ اپنے مادہ سے باب افعال کا مصدر ہے۔ (یہاں اس کی نصب پر آگے "الاعراب" میں بات ہو گی)--- اس مادہ سے فعل مجرد کے باب و معنی کے علاوہ اس سے بابِ افعال (اَحْسَنَ یُحْسِنُ) کے معانی پر بھی البقرۃ : ۵۸ [۲ : ۳۷ : ۱ (۸)] میں بات ہوئی تھی۔ "اِحْسان" کے اصل معنی تو یہ ہیں "کوئی کام بہت اچھے طریقے پر کرنا"۔ مثلاً کہیں گے "اَحْسَنَ الْوُضوءَ" (اس نے بہت اچھے طریقے سے وضو کیا) یا جیسے "فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ" (التغابن : ۳) میں ہے (یعنی تمہاری صورتیں بہت اچھی بنائیں) اگر اس فعل پر (مفعول سے پہلے) "بِ" (باء) یا "اِلٰی" کا صلہ آئے تو اس کا مطلب ہوتا ہے "...سے حسن سلوک کرنا" یا "...کے ساتھ بھلائی کرنا"۔ جیسے "قَدْ اَحْسَنَ بِیْ" (یوسف : ۱۰۰) اور "اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْكَ" (القصص : ۷۷) میں ہے۔ (ان عبارات کے معنی وغیرہ کی حسب موقع وضاحت ہو گی ان شاء اللہ)

● یہاں جو "بالوالدین" پر باء الجر (بِ) آئی ہے اس کا تعلق اسی مصدر "احسان" (جو یہاں منصوب آیا ہے) کے ساتھ (صلہ کا) ہے۔ اس کی اعرابی ترکیب (جو ترجمہ کی بنیاد ہے) پر تو آگے "الاعراب" میں بات ہو گی' یہاں سردست ہم ترجمہ کئے دیتے ہیں۔ اس عبارت (وبالوالدین احسانًا) کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے "اور ساتھ ماں باپ کے حسن سلوک کرنا" (ہو گا)۔ اسی کو مختلف مترجمین نے "ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا/ نیک سلوک کرنا/ اچھی طرح خدمت گزاری کرنا/ حسن سلوک سے پیش آنا/ بھلائی کرتے رہنا" کی صورت میں تراجم کئے ہیں۔ ان تمام تراجم میں فعل امر اور تاکید کا مفہوم موجود ہے (بلکہ بعض نے ترجمہ ہی "سلوک کرو" سے کر دیا ہے)۔ یہ "احسان کرنا" (مصدر) میں "کرنا ہو گا/ کرتے رہنا" (فعل امر) کا مفہوم کیسے پیدا ہوا ہے' اس پر آگے "الاعراب" میں بات ہو گی۔

۲ : ۵۱ : ۱(۲) [وَذِی الْقُرْبٰی] "و" تو عاطفہ "بمعنی "اور" ہے اور "ذی القربٰی" جو

"ذِی" اور "القربٰی" کا مرکب ہے' اس کے دونوں حصوں پر الگ الگ بحث کرنا ضروری ہے۔

(۱) "ذِی" (جس کا اردو ترجمہ ".. والا" ہے) "ذو" کی مجرور صورت ہے (جو "بالوالدین" کی باء الجر پر عطف کے باعث مجرور ہے--- اور "ذُو" اسمائے ستہ مکبّرہ میں سے ایک اسم ہے۔ یہ اسماء "ذُو (والا)' اَبٌ (باپ)' اَخٌ (بھائی)' فَمٌ (منہ)' حَمٌ (سسر) اور ھَنٌ (بری چیز)" ہیں۔ ان میں سے آخری دو تو قرآن میں کہیں استعمال نہیں ہوئے' پہلے چار مختلف حالتوں میں مختلف مقامات پر استعمال ہوئے ہیں۔ ان "اسماء ستہ مکبّرہ" (چھ بڑے کئے ہوئے اسماء) کا مشترکہ قاعدہ تو یہ ہے کہ یہ اسماء جب مضاف ہو کر آئیں تو رفع میں ان کے آخر پر "و" نصب میں الف (ا) اور جر میں "ی" بڑھا دی جاتی ہے (اور اسی اضافہ کی وجہ سے یہ "کبرہ" کہلاتے ہیں) سوائے "ذُو" کے کہ اس کے آخر پر پہلے ہی "واو" ہے' البتہ نصب اور جر میں "ذ" کے بعد علی الترتیب (ا) اور (ی) کا اضافہ ہوتا ہے۔ باقی اسماء پر تو حسب موقع بات ہو گی' یہاں اس "ذُو" کے طریق استعمال کی وضاحت کی جاتی ہے۔

● اس لفظ (ذو) کی مذکر مونث کے لئے مختلف صورتیں ہیں (والا۔ والی کے معنی میں) پھر ہر ایک کے تثنیہ اور جمع کی الگ صورتیں (والے۔ والیاں کے معنی میں) ہیں اور اسماء کی طرح ہر ایک (واحد تثنیہ جمع۔ مذکر مؤنث) کی رفع نصب جر میں الگ الگ شکل ہوتی ہے۔ یعنی اس (ذُو) کی اپنی اعرابی گردان ہے جو اس کی تمام صورتوں کو سمجھنے کے لئے ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

	مذکر کی صورتیں			مؤنث کی صورتیں		
	رفع	نصب	جر	رفع	نصب	جر
واحد	ذُو...	ذَا...	ذِی...	ذَاتٌ...	ذَاتَ...	ذَاتِ...
تثنیہ	ذَوَا...	ذَوَیْ...	ذَوَیْ...	ذَاتَا...	ذَاتَیْ...	ذَاتَیْ...
" (دوسری صورت)	ذَوَا	ذَوَیْ	ذَوَیْ	ذَوَاتَا...	ذَوَاتَیْ...	ذَوَاتَیْ...
جمع	ذَوُوْ...	ذَوِیْ...	ذَوِیْ...	ذَوَاتٌ...	ذَوَاتِ...	ذَوَاتِ...
" (دوسری صورت)	اُولُوْ...	اُولِیْ...	اُولِیْ...	اُولَاتٌ...	اُولَاتِ...	اُولَاتِ...

● ان اسماء کے بارے میں حسب ذیل امور نوٹ کر لیجئے :۔

① یہ تمام اسماء (یا "ذُو" کی مختلف شکلیں) ہمیشہ مضاف ہو کر ہی استعمال ہوتی ہیں۔ اوپر ہر ایک کے بعد جو نقطے (...) ڈالے گئے ہیں اس کا مطلب یہی ہے کہ ان کے بعد ایک مضاف الیہ ضرور آتا ہے۔

② ان کا مضاف الیہ ہمیشہ کوئی اسم ظاہر ہوتا ہے یعنی یہ کسی ضمیر کی طرف مضاف نہیں ہوتے۔ ان

کا اردو ترجمہ حسب موقع "...والا'...والے'...والیاں" سے کیا جائے گا۔

④ آپ نے دیکھا کہ تثنیہ مؤنث کے لئے دو مختلف صورتیں استعمال ہوتی ہیں۔ قرآن کریم میں مؤنث کی صرف دوسری صورت کا ایک ہی لفظ (بحالتِ رفع) "ذَوَاتَا" استعمال ہوا ہے۔ تثنیہ مؤنث کی پہلی صورت قرآن میں کہیں استعمال نہیں ہوئی۔

⑤ جمع میں مذکر مؤنث دونوں کے لئے دو دو صورتیں آئی ہیں۔ قرآن کریم میں زیادہ تر دوسری صورت (اولو' اولات والی) استعمال ہوئی ہے۔

⑥ "اولو...' اولی ...وغیرہ" میں ابتدائی ہمزہ (بصورت الف) کے بعد جو "و" ہے وہ تلفظ میں نہیں آتی مگر لکھی ضرور جاتی ہے (اُولٰئِکَ کی طرح) اور یہ زائد "واو" رسم قرآنی اور رسم املائی دونوں میں لکھی ضرور جاتی ہے (اگرچہ پڑھی نہیں جاتی)

⑦ "ذُو" کی اس گردان کے مختلف کلمات ذہن نشین کر لیں' کیونکہ ان میں سے بیشتر صورتیں قرآن کریم میں ہمارے سامنے آئیں گی۔ اب ہم اس ترکیب (ذِی القربٰی) کے دوسرے لفظ "القربٰی" کو لیتے ہیں۔

(۲) "اَلْقُرْبٰی" کا مادہ "ق ر ب" اور وزن (لام تعریف نکال کر) "فُعْلٰی" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد (قَرُبَ یَقْرُبُ = قریب ہونا۔ قریب جانا) کے ابواب اور معنی و استعمال کی تشریح البقرہ : ۳۵ [۲ : ۲۶ : ۱ (۸)] میں کی جا چکی ہے۔

● یہ لفظ (قُرْبٰی) اس مادہ سے افعل التفضیل (اَقْرَبُ) کا صیغۂ مؤنث ہے جس کا ترجمہ تو بنتا ہے "بہت زیادہ قریب (کوئی مونث) چیز"--- تاہم عربی میں یہ لفظ "قرابت" (قریب کی رشتہ داری) کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ "قَرَابَة" بھی اس معنی کے لئے عربی لفظ ہے (جو "قرابت" کی املاء کے ساتھ اردو میں مستعمل ہے) تاہم یہ لفظ (قَرَابَة) قرآن کریم میں نہیں آیا۔ البتہ اس کے دو ہم معنی لفظ "قُرْبٰی" اور "مَقْرَبَة" قرآن کریم میں استعمال ہوئے ہیں۔

● اس طرح "ذِی الْقُرْبٰی" کا ترجمہ ہوا "قرابت / قریبی رشتہ داری والا"۔ جس کا سادہ بامحاورہ ترجمہ "رشتہ دار" بھی ہو سکتا ہے۔ چونکہ اس ترکیب (ذی القربی) کا تعلق گزشتہ عبارت کے "اِحسانًا" (بھلائی کرتے رہنا) سے ہے اس لئے مختلف مترجمین نے یہاں "ذِی القربٰی" کا ترجمہ "قرابت والے سے" کیا ہے اور بیشتر نے بصورتِ جمع "قرابت داروں سے / کنبہ والوں سے / رشتے داروں سے / اہل قرابت کی بھی / ناتے رشتے والوں سے" کے ساتھ ترجمہ کیا ہے جو مفہوم اور محاورے کے لحاظ سے ہی درست ہے ورنہ اصل عبارت میں صیغہ جمع (مثلاً ذَوِی

القربٰی یا اُولِی القربٰی) تو نہیں آیا بلکہ واحد (ذِی) ہی ہے۔

۲ : ۵۱ : ۱(۳) [وَالْيَتَامٰى] "و" (اور) کے بعد لفظ "الیتامٰی" ہے (جو یہاں سمجھانے کے لئے رسم املائی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس کے رسم عثمانی پر آگے بات ہو گی) اس لفظ (الیتامٰی) کا مادہ "ی ت م" اور وزن اصلی (لام تعریف نکال کر) "فعَالٰی" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "یَتُمَ یَیْتُمُ یُتْمًا" (ضرب' سمع اور کرم سے) استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی ہیں : کسی بچے کا باپ مرجانا۔ یعنی "یتیم" ہو جانا۔ "یَتِیمٌ" (بروزن فَعِیلٌ) خالص عربی لفظ ہے جو اردو میں متعارف اور متداول ہے۔ اس کی جمع مکسر "اَیْتَام" بھی آتی ہے (مگر یہ قرآن میں استعمال نہیں ہوئی) اور "یَتَامٰی" بھی' جو قرآن کریم کے اندر معرف باللام شکل میں ۱۴ جگہ آئی ہے۔ اور اس کا واحد "یَتِیم" بھی بصورت نکرہ قرآن میں بصورت معرفہ نکرہ آٹھ جگہ آیا ہے اور ایک جگہ اس کا تثنیہ "یَتِیمَیْن" بھی آیا ہے --- عربی زبان میں تو اس مادہ "یتم" سے مجرد کے علاوہ بعض مزید فیہ ابواب سے بھی افعال مختلف معانی کے لئے استعمال ہوتے ہیں تاہم قرآن میں اس مادہ سے کسی قسم کے فعل کا کوئی صیغہ کہیں نہیں آیا۔

● "یَتْمٌ" کے بنیادی معنی "اکیلا رہ جانا" ہے۔ اسی لئے عربی میں ایسے موتی کو جس کے ساتھ کا (اس جیسا) اور کوئی موتی نہ ہو "درّۃٌ یتیمٌ" یا ایسا ایک ہی ہونے کی وجہ سے "درّۃٌ یتیمۃٌ" کہتے ہیں (اس میں تائے وحدت ہے) انسانوں میں سے عربی میں اس چھوٹے بچے کو یتیم کہتے ہیں جس کا باپ مرگیا ہو --- مگر حیوانات میں اسے "یتیم" کہا جاتا ہے جس کی ماں مرگئی ہو (اور "یتیم" مذکر و مونث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے) --- اور انسانوں میں بھی "یتیم" چھوٹی عمر کا ہی کہلاتا ہے۔ بالغ ہو جانے کے بعد کسی "مرے ہوئے باپ والے" کو یتیم نہیں کہا جاتا۔

● زیر مطالعہ عبارت میں "والیتامٰی" کا تعلق بھی "اِحسانًا" سے ہے اس لئے اس کا ترجمہ بھی "یتیموں/بے باپ کے بچوں سے بھی" کیا گیا ہے۔ "بھی" کا لفظ اردو محاورے کے مطابق واوِ عاطفہ کی تکرار کے لئے لایا گیا ہے۔

۲ : ۵۱ : ۱(۴) [وَالْمَسَاكِيْنِ] یہاں بھی فرق سمجھانے کے لئے "المساکین" کو عام رسم املائی کے مطابق لکھا گیا ہے۔ رسم عثمانی پر الگ "الرسم" میں بات ہو گی۔ "المَسَاکِینُ" کا مادہ "س ک ن" اور وزن (لام تعریف کے بغیر) "مَفَاعِیلُ" ہے جو منتہی الجموع (آخری درجے کی جمع) کا ایک وزن ہے۔ تمام منتہی الجموع وزن غیر منصرف ہوتے ہیں۔ "مَساکین" کا واحد "مِسْکِینٌ" (بروزن "مِفْعِیلٌ") ہے (جو معرب ہے)۔ اس مادہ (س

ک ن) سے فعل مجرد (سکَن یسکُن = ٹھہرنا۔ ٹھہر جانا) کے باب و معنی وغیرہ البقرہ : ۳۵ [۲ : ۳۶ : ۱ (۱)] میں بیان ہو چکے ہیں۔

● عربی زبان کے دو لفظ "مِسکِین" اور "فَقِیر" ایسے ہیں جو "نادار' غریب' محتاج' مفلس' تنگ دست" کے اصل عربی معنوں کے ساتھ اردو میں بھی عام مستعمل ہیں۔ اور یہ لفظ (یا ان کی جمع "مساکین اور فقراء") قرآن و حدیث اور عربی ادب میں بکثرت وارد ہوئے ہیں (لفظ "مِسکِین" واحد جمع معرفہ نکرہ مختلف صورتوں میں قرآن کریم کے اندر ۲۳ جگہ اور لفظ "فَقِیر" اسی طرح (واحد جمع معرفہ نکرہ) ۱۲ جگہ آیا ہے)۔ اس لئے عربی کی بڑی معاجم (ڈکشنریوں) اور تفاسیر میں بھی یہ بحث بعض دفعہ کئی کئی صفحات میں کی گئی ہے کہ مالی لحاظ سے (اور بعض دفعہ سماجی لحاظ سے بھی) کس کی حالت' دوسرے سے "بہتر" اور کس کی "بدتر" ہوتی ہے؟ فقیر کی یا مسکین کی؟۔ اور پھر ہر ایک نقطۂ نظر کی تائید میں قرآن' حدیث اور اشعار و اقوالِ عرب سے دلائل لانے اور دلائل کو رد کرنے پر بہت سا مواد جمع کر دیا گیا ہے۔ {۱}

● بعض کے نزدیک "فقیر" وہ ہے جو بالکل نادار ہو اور اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور "مسکین" وہ ہے جس کے پاس کچھ مال تو ہو (یا کوئی ذریعۂ معاش تو ہو) مگر اس کے ضروری اخراجات کے لئے بھی کافی نہ ہو --- اور بعض نے ان کی تعریف اس کے برعکس کی ہے۔ اس بات پر البتہ اتفاق ہے کہ لغوی اصل کے لحاظ سے "مسکین" میں عاجزی' تواضع اور انکسار کا مفہوم زیادہ ہے اور "فقیر" میں حاجت مندی اور ناداری کا مفہوم زیادہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "فقر" یعنی مفلسی سے پناہ مانگی ہے اور "مسکین" رہنے اور مسکینوں میں شامل رہنے کی دعا فرمائی ہے۔ اور اس میں "مسکین" سے مراد متواضع اور غیر متکبر آدمی ہے۔

● اس طرح زیر مطالعہ عبارت میں "وَالْمَسَاکِین" کا ترجمہ "اور فقیروں' محتاجوں' مسکینوں اور غریبوں" (سے بھی حسن سلوک کرنا) کی صورت میں کیا گیا ہے۔ کیونکہ اردو میں "مسکین" اور "فقیر" قریباً مترادف لفظ سمجھے جاتے ہیں۔ اور عربی والی "باریک بینی" سے محفوظ ہیں۔

[وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا] یہ بھی ایک پورا جملہ ہے جو "وَ" (اور) + "قُولُوا" (تم کہو) + "لِلنَّاسِ" (لِ + الناس = لوگوں سے) + "حُسْنًا" (خوبصورتی) پر مشتمل ہے۔ یہ تمام کلمات (ماسوائے "حُسْنًا" کے) پہلے گزر چکے ہیں مثلاً

{۱} مثلاً چاہیں تو دیکھئے لسان العرب (مادہ "سکن") اور Lane's Lexicon یعنی "مد القاموس" (مادہ "سکن" میں سب سے آخری بحث) ج ۴ ص ۱۳۹۵

① "وَ" کی اقسام و معانی کے لئے دیکھئے [۱ : ۴ : ۱ (۳)] اور [۲ : ۷ : ۱ (۱)]

② "قُولُوا" جس کا مادہ "ق و ل" اور وزن اصلی "اُفْعُلُوْا" ہے کے فعل' اس کے باب و معنی اور خود اس لفظ "قُولُوا" کی لغوی و صرفی تشریح [۲ : ۳۷ : ۱ (۳)] میں گزر چکی ہے۔

③ "لِلنَّاسِ" کا لام الجر (لِ) دراصل فعل "قَالَ یَقُوْلُ" (کہنا) کا صلہ ہے اور لفظ "النَّاس" (لوگوں) کے مادہ کے بارے میں مختلف اقوال اور ہر ایک کے معانی وغیرہ پر مفصل بحث البقرہ : [۲ : ۷ : ۱ (۳)] میں دیکھئے۔

④ "حُسْنًا" جو "ح س ن" مادہ سے مشتق اسم (بروزنِ "فُعْلٌ") ہے' کے معنی تو ہیں "خوبصورتی۔ خوبی"۔ مگر یہاں مراد ہے خوبصورت بات' اچھی بات' اس مادہ (حسن) سے فعل مجرد کے استعمال پر البقرہ : ۵۸ [۲ : ۳۷ : ۱ (۸)] میں بات ہو چکی ہے۔

● یہاں اس عبارت کے تراجم "اور کہو' کہیو' کہنا' بات کرنا' بات کرو/لوگوں سے' سب لوگوں کو' عام لوگوں سے/بھلائی' نیک بات' بات اچھی طرح' اچھی بات' نرمی' خوش خلقی کی اور اچھی باتیں"--- کی صورت میں کئے گئے ہیں۔ تاکید کا مفہوم (کہیو/کہنا میں) تو "شرائطِ میثاق" سے پیدا ہوا ہے جس پر پہلے "لَا تَعْبُدُوْنَ" میں بات ہوئی ہے۔ "لوگوں" کے "ساتھ" "سب" اور "عام" کا اضافہ معرف باللام جمع (الناس) کی وجہ سے ہے --- یہاں "حُسْنًا" منصوب کیوں ہے؟ اور اس میں "نیک بات/اچھی بات وغیرہ" کا مفہوم کیسے پیدا ہوا ہے؟ اس پر آگے حصہ "الاعراب" میں بات ہوگی۔

[وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ] یہ دونوں جملے بعینہٖ اسی طرح البقرہ : ۴۳ [۲ : ۲۹ : ۱] میں گزر چکے ہیں۔ اور ان کے تراجم و لغوی تشریح بھی وہاں ہوئی تھی۔ اگر بات ذہن سے اتر گئی ہو تو صرف یاد دہانی کے لئے ہر ایک کلمہ کا الگ الگ مختصراً گزشتہ حوالہ لکھے دیتے ہیں۔

① "اَقِیْمُوا" کا مادہ "ق و م" اور وزن "اَفْعِلُوْا" ہے جو باب افعال سے فعل امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے بمعنی "تم قائم کرو" دیکھئے البقرۃ : ۳ [۲ : ۲ : ۱ (۳)]

② "الصلٰوۃ" مادہ "ص ل و" اور وزن اصلی "فَعَلَۃ" ہے۔ دیکھئے [۲ : ۲ : ۱ (۴)] میں

③ "وَاٰتُوا" جو "ا ت ی" مادہ سے باب افعال کا فعل امر بروزن "اَفْعِلُوْا" ہے بمعنی "دو/ادا کرو" اور

④ "الزکٰوۃ" جو "ز ک و" سے بروزن "فَعَلَۃ" ہے۔ ان دونوں کلمات "آتوا اور الزکٰوۃ" کی مکمل لغوی تشریح کے لئے دیکھئے البقرۃ : ۴۳ [۲ : ۹ : ۱ (۴-۵)]

● یہاں بھی ابتدائے آیت کے "اخذ میثاق" (عہد لینا' والے مفہوم کی بنا پر فعل امر کے ان صیغوں کا ترجمہ "تاکید" کے الفاظ کے ساتھ کیا گیا ہے یعنی

"اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" کا ترجمہ "قائم رکھو نماز کو/پابندی رکھنا نماز کی/درست کیجئو نماز/درستی سے نماز ادا کرنا/نماز قائم رکھنا" کی صورت میں کیا گیا ہے۔ ان سب تراجم میں میثاق والی تاکید کے علاوہ فعل "اقَام یُقِیمُ" کے معنوی تقاضے ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ اسی طرح "الزکٰوۃ" کا ترجمہ "زکٰوۃ" ہی سے کرتے ہوئے "وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ" کے تراجم "زکوٰۃ دو/نکالو/دیتے رہیو/ادا کرتے رہو/ادا کرتے رہنا" کی صورت میں کئے ہیں۔ مفہوم قریباً یکساں ہے۔ اور بعض نے اردو محاورے کی خاطر ساری عبادت کا اکٹھا ترجمہ "اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہنا" سے کیا ہے۔

[ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ] اس جملے کے بھی تمام کلمات کی لغوی تشریح پہلے ہو چکی ہے اور ابتدائی حصہ "ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ" اسی طرح البقرۃ: ۶۴ [۲: ۴۱ (۴)] میں بھی آیا تھا۔ ہم یہاں تمام کلمات کا صرف ترجمہ الگ الگ لکھ کر ساتھ لغوی تشریح کا گزشتہ حوالہ لکھ دیتے ہیں۔ چاہیں تو وہاں دیکھ لیں۔

① "ثُمَّ" (پھر/اس کے بعد) کی مزید وضاحت کے لئے دیکھئے البقرہ: ۲۸ [۲: ۲۰ (۴)]

② "تَوَلَّیْتُمْ" جو "و ل ی" مادہ سے بلحاظ وزن "تَفَعَّلْتُمْ" ہے یعنی باب تفعل کا فعل ماضی صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد اور باب تفعل کے فعل (تَوَلّٰی یَتَوَلّٰی) کے معانی وغیرہ البقرہ: ۶۴ [۲: ۴۱ (۴)] میں دیکھئے۔ "تَوَلَّیْتُمْ" کا ایک ترجمہ "تم پھر گئے" بنتا ہے اور یہاں یہی مراد ہے۔

③ "اِلَّا" (پھر/مگر/سوا) کے معانی و طریق استعمال کے لئے دیکھئے البقرہ: ۹ [۲: ۸ (۳)]

④ "قَلِیْلًا" (تھوڑا/بہت کم) جو "ق ل ل" مادہ سے بروزن "فَعِیلٌ" اسم صفت ہے' کی لغوی تشریح البقرہ: ۴۱ [۲: ۲۸ (۱۲)] میں "ثَمَنًا قَلِیْلًا" کے ضمن میں دیکھئے۔

⑤ "مِّنْکُمْ" (تم میں سے) جو "مِن + کُم" ہے۔ "مِن" کے معانی کے لئے دیکھئے البقرہ: ۱۳ [۲: ۲ (۵)]

● اس طرح اس زیر مطالعہ عبارت کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "پھر تم سب پھر گئے مگر تھوڑے تم میں سے"۔ پھر بامحاورہ ترجمہ کے لئے ابتدائی حصے کا ترجمہ تو سب نے "پھر تم پھر گئے/پھر بیٹھے" ہی سے کیا ہے' البتہ "اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ" کا ترجمہ کئی صورتوں میں کیا گیا ہے' مثلاً "مگر تھوڑے تم میں سے/مگر تھوڑے سے تم میں/بجز معدودے چند کے/تم میں سے تھوڑے آدمیوں کے سوا (باقی

سب)/مگر تم میں کے تھوڑے/سوائے تھوڑے سے آدمیوں کے/مگر تھوڑے/تو چند شخصوں کے سوا/بجز تم میں سے معدودے چند کے" کی صورت میں۔ ان تراجم میں بعض نے تو اس (اِلَّا قَلِیلًا مِّنکُم) کا ترجمہ فقرے کی عربی ترتیب کے مطابق "ثُمَّ تَوَلَّیتُم" کے بعد کیا ہے اور بعض نے فقرے کی اردو ساخت کے مطابق اس حصے (اِلَّا قَلِیلًا مِّنکُم) کا ترجمہ شروع میں کیا ہے۔ بعض اردو تراجم اصل عربی سے بھی بھاری بھرکم ہیں (مثلاً "بجز معدودے چند" والا)۔ پھر بعض نے عربی کے "تَوَلَّیتُم" اور "مِّنکُم" میں دو دفعہ آنے والی ضمیر کا ترجمہ دو دفعہ "تم" سے کیا ہے اور بعض نے اردو محاورے کے مطابق ایسے موقع پر صرف ایک "تم" کا استعمال کافی سمجھا ہے۔

۲ : ۵۱ : ۱ (۵) [وَاَنتُم مُّعرِضُونَ] یہ بھی ایک جملہ ہی ہے جس کی ابتدائی "وَ" حالیہ (بمعنی حالانکہ) ہے' اگرچہ اس کا عام اردو ترجمہ "اور" سے ہی کر دیا جاتا ہے' تاہم مفہوم "اور حال تو یہ ہے کہ" کا ہی ہوتا ہے۔ ضمیر مرفوع منفصل "اَنتُم" کا اردو ترجمہ "تم" ہے مگر اس سے پہلے (پچھلے جملے میں) دو دفعہ "تم" آ چکا ہے ("تَوَلَّیتُم" کی ضمیر فاعلین اور "مِّنکُم" کی ضمیر مجرور کی صورت میں) اس لئے اس "تم" کی تکرار کی بناء پر یہاں "اَنتُم" کا بامحاورہ ترجمہ تاکید کے مفہوم کے ساتھ "تم تو ہو ہی/تم کچھ ہی ہو/تم ہی ہو" کی صورت میں کیا ہے اور بعض نے "وَاَنتُم" کا ترجمہ ہی "اور تمہاری تو معمولی عادت ہے" سے کیا ہے جو صاف ظاہر ہے کہ ترجمہ (اور عبارت) کی حد سے تجاوز ہے' چاہے محاورہ اور مفہوم کے لحاظ سے درست بھی سمجھا جائے۔

● "مُّعرِضُونَ" کا مادہ "ع ر ض" اور وزن "مُّفعِلُونَ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد (عَرَضَ یَعرِضُ = پیش کرنا۔ سامنے لانا) کی وضاحت البقرہ : ۳۱ [۲ : ۲۳ : ۱ (۴)] میں کی جا چکی ہے۔ یہ کلمہ (مُّعرِضُونَ) اس مادہ سے باب افعال کا اسم الفاعل (صیغہ جمع مذکر سالم) ہے۔ اس باب سے فعل "اَعرَضَ ... یُعرِضُ اِعرَاضًا" بطور فعل لازم و متعدی مختلف معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے مثلاً (۱) نمودار ہونا۔ ظاہر ہو جانا۔ جیسے اَعرَضَ الشَّیءُ (چیز ظاہر ہوئی) (۲) چوڑا (بڑے عرض والا) ہونا جیسے "اَعرَضَ الثَّوبُ" (کپڑا بڑے عرض والا تھا) (۳) "فِی" کے صلہ کے ساتھ یہ "کسی چیز کی لمبائی چوڑائی سے واقف ہونا" کے معنی دیتا ہے جیسے "اَعرَضَ فِی العِلمِ" (علم کی وسعت سے آگاہ ہوا)۔ (۴) بطور فعل متعدی اس کے معنی "... کو چوڑا (عرض والا) کرنا" ہوتے ہیں جیسے "اَعرَضَ الشَّیءَ" (اس نے چیز کو چوڑا کر دیا)۔ (۵) اور "عَن" کے صلہ کے ساتھ اس کے معنی ہوتے ہیں "... سے منہ پھیر لینا/... پر متوجہ نہ ہونا/... سے روگردان ہونا/... سے بے پرواہ ہونا/... پر دھیان نہ دینا" ---- جیسے "مَن اَعرَضَ عَن ذِکرِی" (طٰہٰ : ۱۲۴) یعنی "جس نے میری یاد

سے منہ پھیر لیا" میں ہے۔ تاہم قرآن کریم میں یہ فعل صرف آخری معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے۔ باقی (مذکورہ بالا چار) معانی کے لئے یہ فعل قرآن میں کہیں نہیں آیا۔

● ان (منہ پھیر لینا والے) معنی کے لئے اس فعل (اَعْرَضَ یُعْرِضُ) سے مختلف صیغہ ہائے فعل قرآن میں ۳۲ جگہ آئے ہیں۔ ان میں سے ۲۳ جگہ تو اس کے ساتھ مفعول (جس سے منہ پھیرا جائے) کا ذکر "عَنْ" کے صلہ کے ساتھ آیا ہے' باقی نو مقامات پر یہ صلہ استعمال نہیں ہوا مگر سیاقِ عبارت سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کس چیز سے منہ پھیر لینے کا ذکر ہے۔ صیغہ ہائے فعل کے علاوہ دو جگہ اس فعل کا مصدر "اِعْرَاض" بھی (عَنْ کے بغیر ہی) استعمال ہوا ہے اور اس سے اسم الفاعل "مُعْرِضٌ" کی صرف جمع سالم مذکر "مُعْرِضُوْن" ہی مختلف اعرابی حالتوں میں (مرفوع یا منصوب) ۱۹ جگہ استعمال ہوئی ہے اور اس کے ساتھ بھی ۱۲ جگہ تو "عَنْ" آیا ہے باقی جگہ محذوف مگر مفہوم ہے (یعنی سمجھا جا سکتا ہے)۔

● یہاں زیرِ مطالعہ عبارت میں بھی "مُعْرِضُوْنَ" عَنْ کے بغیر ہی آیا ہے' تاہم سیاقِ عبارت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں اسی "میثاق" (عہد) سے منہ موڑنے والوں کی بات ہو رہی ہے۔ بیشتر مترجمین نے "وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ" کا ترجمہ "عَنْ" کے نہ ہونے کی بناء پر (... سے منہ پھیرنا) کی بجائے صرف "پھر جانا" سے ہی کر دیا ہے یعنی "تم ہو ہی پھرنے والے / ہو ہی تم لوگ پھرنے والے" کی صورت میں ("ہو ہی" لانے کی وجہ اوپر بیان ہوئی ہے) بعض نے ("پھر جانا" کی بجائے دوسرے الفاظ کے ساتھ ترجمہ "تم کو دھیان نہیں / تم بے پروا ہو / تم روگردان ہو / تم ہی ہو گردن کش" کی صورت میں کیا ہے۔ صرف ایک آدھ نے "منہ پھیرنے والے" سے ترجمہ کیا ہے جب کہ بعض نے "منہ پھیر کر پھر بیٹھے" کی صورت میں اسم کی بجائے فعل سے ترجمہ کر دیا ہے' جس کی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ ایسے موقع پر جملہ اسمیہ جس میں خبر کوئی اسمِ صفت ہو (جیسے یہاں "تُعْرِضُوْنَ" کی بجائے خبر "مُعْرِضُوْنَ" ہے) یہ کسی مستقل عادت کے بیان کے لئے آتا ہے۔ اسی لئے بعض مترجمین نے اس مفہوم کی وضاحت کے لئے ترجمہ ہی "تمہاری تو معمولی عادت ہے اقرار کر کے ہٹ جانا" کی صورت میں کر دیا ہے جو ترجمے کی حدود سے بہرحال تجاوز ہے' چاہے مفہوم درست ہی سہی۔ بہرحال ان ترجموں میں سے بہترین ترجمہ "تم تو ہو ہی پھر جانے والے" ہے جس میں عادت کا مفہوم بھی ہے اور مخاطب ضمیروں کی تکرار کے لئے "ہی" کا بامحاورہ استعمال بھی ہے۔

(جاری ہے)

The spirit of Islamic revivalism and the aspiration to establish the ideal Islamic system, as generated by the Jamaat-e-Islami, has influenced a considerable section of Muslim youth in the Indo-Pakistan subcontinent. Simultaneously, the same spirit – initiated by Hassan Al-Banna when he established the Muslim Brotherhood in 1928 – has been active throughout most of the Arab world. Although the widespread impact produced by these movements is beyond dispute, it must be realized that lack of a unanimous policy in relation to the all important matter of methodology has been responsible for the creation of a number of divisions among them, leading to the formation of various smaller parties and organizations. For example, though the Muslim Brotherhood in Egypt and Jordan has, in general, taken the path of peaceful social and political struggle, some of its dissatisfied offshoots have adopted violent or even terrorist methods for achieving the same objective.

However, such radical organizations, along with the enthusiasm of other non-violent but nevertheless revolutionary groups, have succeeded in bringing the goal of Islamic Resurgence a bit closer to reality – at least in the eyes of the West. The whole phenomenon has produced a sense of shock and alarm among the Western powers and their "Muslim" stooges, despite the fact that the actual achievements of parties like Takfir-wal-Hijra, Al-Jehad, Islamic Tendency Society, Jamaa Islamia, Hizb ut-Tahrir, and Islamic Salvation Front, are as yet far from the establishment of an Islamic state. One can have a number of disagreements with each of these organizations, but it has to be admitted that these movements represent, as a whole, the revivalist aspirations of the Muslim Ummah, and have become a force that has to be recognized at the international level. The role of the revolution in Iran and the rise of Shei'te fundamentalism is also significant in this respect.

To Be Continued

a certain point in its history the Al-Ikhwan Al-Muslimun or the "Muslim Brotherhood" of Egypt had become the focus of all revivalist aspirations due to its unprecedented fervor and influence, the fact remains that the real superiority in this field too -- belongs to the Indian subcontinent.

The first person to invite the Muslims towards the struggle for Islamic revival in the Indian subcontinent was late Abul Kalam Azad (1888-1958), who, during the early part of the present century, called for the establishment of "God's Kingdom" through his pioneering magazines *Al-Hilal* and *Al-Balahg*, and, in order to reach that goal, formed a group known as "*Hizbullah*". His ability to motivate the audience through a unique style of writing and oratory, which was especially prominent during the Khilafat Movement, made him a well-known public figure throughout the subcontinent, and his own sincerity and enthusiasm conquered the hearts of millions of Indian Muslims. If it were not for the opposition and obstructions created by some of the traditional scholars, he would have been selected as the all-powerful *Imamul Hind* during the early '20s. Disillusioned and frustrated by the lukewarm response from the religious establishment, Abul Kalam gave up his mission altogether, and, from then onwards, dedicated his life to the nationalist politics of India, until his death in 1958.

The echoes of his vehement and vociferous clarion call to the Qur'an and Jihad continued to reverberate in the four corners of Muslim India. Like the second runner in a relay race, another unconventional and courageous young man appeared on the scene with the firm resolve to continue the mission that was forsaken by Maulana Abul Kalam. He worked alone for nearly seven years as a journalist, presenting a methodology for the establishment of "God's Kingdom" and the revival of Islam as a complete way of life. He then worked for sometime at "Darul Islam" -- an Islamic research academy created by Chaudhry Niaz Ali Khan, a devotee of Alma Iqbal. He finally laid the foundation of his own party, Jamaat-e-Islami, in 1941, and started an organized movement. This young man was, of course, none other than Maulana Sayyad Abul Ala Mawdudi (1903-1979).

influenced by Tablighi Jamaat are, in general, simple folks or those who are untouched by the atheistic and materialistic philosophies of the West, and who already have a dormant inclination towards religious and moral virtue. Despite this limitation, the movement of Tablighi Jamaat certainly occupies an important position within the larger process of Islamic Renaissance, in relation to its effort for the regeneration of faith among the masses.

IslamicResurgence

We are definitely indebted to the arduous and often unrewarded efforts by our Ulama, as they have succeeded in keeping the structure of traditional beliefs and rituals intact during the extremely unfavorable period of Western colonialism. However, the most significant aspect of the process of our revival concerns an entirely different type of response to the decline of Muslims. The forerunners in the revivalist movement are all those organizations and groups which were created with this very purpose in mind, i.e., to re-awaken the Ummah and to re-establish the domination of Islam. Such groups and parties have categorically rejected the prevalent responses to Westernization — either withdrawing in the shells of tradition, or blindly accepting whatever arrives from the West. Instead, they have emphasized, again and again, that Islam is not merely a collection of dogma, rituals, and customs, as are other religions, but that it is the God-given *Deen*, i.e., a complete way of life encompassing the whole spectrum of human activity, including its social, cultural, legal, economic, and political aspects. And, most importantly, like all other ways of life, Islam demands its complete and total ascendancy, and the struggle to establish that ascendancy is the duty of every Muslim

For a number of centuries, India and Egypt have held the distinction of being the two most prominent centers of culture and learning in the Muslim world. It is hardly surprising, therefore, that the two major revivalist movements of the twentieth century — *Jamaat-e-Islami* and *Al-Ikhwan Al-Muslimun* — rose from the Indian subcontinent and Egypt, respectively. Although at

touch with developments in contemporary philosophical, social, and scientific thought. Imam Ghazzali (1058-1111) and Imam Ibn-e-Taimiyyah (1263-1328) were able to defeat the onslaught of Greek Philosophy and Aristotelian Logic only after a careful and deep study of these invading ideas. Similarly, in order to deal with the modern ideologies that are seeking to destroy the foundations of Islamic faith, we need first to clearly discriminate between what is and what is not against the spirit of the Qur'an. Afterwards, we need to refute that part of the invading ideologies which is in opposition to the Qur'anic spirit, and to accept and incorporate the part that is in accordance with its spirit into a new and contemporary interpretation of Islam. Unfortunately, this is not being done by our religious scholars.

The role of the Ulama today, instead of being that of an engine capable of propelling forward the ship of Islam, is actually nothing more than that of a heavy anchor which prevents the ship from drifting away in any wrong direction. Although, under the present circumstances, even this is a commendable and substantial service, the fact remains that this is by no means enough.

Another aspect of the activity of our Ulama that needs correction is their unusually strong emphasis on sectarian matters. A serious stagnation of thought along with dogmatism has set in ever since the practice of *Ijtehad* was done away with. The religious seminaries and Ulama of every sect are therefore spending most of their time and energies in defending and propagating their particular brand of dogma and ritual, often insisting that any variation in such matters is nothing short of apostasy. Such narrow-mindedness has exacerbated the evil of sectarianism and the resulting intolerance among the masses has led to a dangerous militancy.

One very important movement that has originated from the School of *Deoband*, the great theological seminary in India, is that of the "*Tablighi Jamaat*", which has succeeded in causing a massive religious mobilization among the Muslims. Tablighi Jamaat has made headway in focusing the attentions of a big section of Muslim population towards the renewal of faith. However, the overwhelming majority of the people being

establish the ascendancy of the politico-socio-economic system of Islam, they are often unaware of even the existence of such a need. Therefore, the services of the Ulama can be seen as a continuation of the efforts of previous reformers of Islam, in that the nature of their efforts – like the services of present-day Ulama – was mainly focused on the *defensive* rather than on the *revivalist*. Our noble ancestors were justified in narrowing down their fields of activity because the cultural and legal system of Islam was still very much intact in those days, and the predominent need of their time was merely to preserve the religious faith in its original form and to defend it against foreign influences. As a result, all our past reformers concentrated their energies in the academic fields, or, at the most, in the moral and spiritual purification of common Muslims. None of them tried to launch any organized political or militant movement, as Prophet Muhammad (Peace be upon him) had set strict restrictions on such a rebellion against Muslim rulers. According to the popular interpretation of some a'hadith, as long as the *Shariah* is being enforced and no flagrant violation of Islam is being committed, it is not considered permissible to revolt even if the rulers are themselves wicked and oppressive. Therefore, as soon as the situation changed, and non-Muslims started to conquer and occupy Muslim territories, the reformist efforts quickly turned into armed struggles. Prominent examples of this phenomenon include the Mujahideen movement of Sayyad Ahmed Shaheed (1786-1831) in India, the Sanussi movement in Libya – started by Sayyad Muhammad Ibn Ali as-Sanussi (1787-1859) – and its struggle against Italian occupation up to 1932, and the Mahdist movement – initiated by Muhammad Ahmad (1844-1885) – that resisted the British invasion in Sudan.

It is obvious that, even today, our orthodox Ulama are following in the footsteps of earlier reformers, who had worked under completely different conditions. In other words, traditional Muslim Ulama have, in general, restricted themselves and their abilities within a rather narrow circle of activity, which is essentially defensive rather than revivalist. Moreover, even the task of defending Islamic doctrines is not being properly done by the Ulama, as they are, more often than not, completely out of

the personality of Allama Iqbal (1877-1938), whose poignant and moving poetry had aroused and invigorated the Indian Muslims from their appalling lassitude and apathy.

Second Dimension

The liberation of Muslim states from the yoke of Western Colonialism was only the first stage in the ongoing process of Islamic revival. We now turn to the second dimension of this process, which is the role of traditional and orthodox religious scholars or *Ulama*. Numerous organizations of these Ulama, belonging to various schools of thought, are actively pursuing the mission of serving Islam and Muslims along the lines of their own particular methodology. In this respect too, the Indian subcontinent enjoys an outstanding and unparalleled superiority, in that the grip of the Ulama over the masses and the popular support for the orthodox Islam in this part of the world is unmatched in the entire Muslim Land. Even the Arabian peninsula, which was dominated by the effects of the reformist movement of Muhammad Ibn Abdul Wahhab (1703-1792) up to the middle of the present century, has now been left too far behind the Indian subcontinent in this regard,

The reason for this phenomenon is not at all difficult to discern. A comprehensive, versatile, and extraordinary figure like Shah Waliyullah of Delhi (1703-1762), is not to be found anywhere else in the Muslim world during the last three hundred years. His gigantic efforts in shifting the focus of Muslims from trivial legalities back to the original sources of Islamic faith and knowledge – the Holy Qur'an and the Hadith – and his restructuring of Islamic thought and philosophy were certainly unparalleled achievements. It was his pioneering work that had led to the enhancement of the respect for religion and religious scholars in the Indian subcontinent.

However, we must keep in mind that the main thrust of the efforts of our Ulama is directed only towards safeguarding and preserving the dogmatic, ritualistic, and institutional structure of Islam. As regards fulfilling the requirements and demands of reviving Islam in the present Westernized milieu, and to re-